استنباط احکام کے بنیادی اصول: ایک تعارف

Principles of Deriving Islamic Rulings: An Introduction

☆ ڈاکٹر قاری تاج افسر

ABSTRACT

The Qur'an serves as the basic source of Islamic laws. These laws encompass all gamut of human life. The Prophet (s.a.w.) applied certain principles in deriving legal rulings from the Qur'an. The Companions after him not only continued with the same principles but also expanded their scope. After them their disciples (tābiyen) perfected the principles of deriving legal rulings from the Qur'an. When the Muslim jurists (fuqahā') came on the stage to play their role, the principles of deriving Islamic laws from the sacred source became more elaborate. This article introduces the contributions of the Last Prophet (s.a.w.), the Companions, their disciples, and Muslim jurists toward the development of principles of how to derive legal rulings from the Qur'an.

قرآن حکیم کتاب ہدایت ہے اور اس کے نزول کا مقصد انسانیت کے جملہ مسائل کا حل پیش کر کے اس کا تعلق اللہ تعالی سے قائم کرنا ہے۔ اس کی عالمگیریت ایک طرف جبکہ دوسری طرف اس کا نزول عربی زبان میں ہوا اور عربوں کے تہذیب وتمدن اور ان کے اسلوب پر نازل ہوا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ عربوں کو اس کے سمجھنے اور اس سے مسئلہ اخذ کرنے کے حوالے سے کوئی دقت پیش نہیں آئی لیکن غیر عرب اقوام کے لئے یہ کام نہایت مشکل تھا۔ حکمت قرآنی کا تقاضا تھا کہ عربی اسلوب میں اپنے انداز بیان کو لپیٹ کر فطرت انسانی کو بیدار کیا جائے تاکہ عربی تمدن کے پس منظر میں جو حقیقت پنہاں ہے اس تک رسائی حاصل ہو سکے اور انسانی سماج جس وحدت پر قائم ہے اور جو اس کے فطری رجحانات ہیں اس کے ذریعے قرآنی احکام کو سمجھا جائے اور اس کی عالمگیریت کو عملی جامہ پہنایا جاسکے۔ اس مقصد کے لئے نبی اکرم ﷺ نے قرآن حکیم کے عام کی تخصیص کی، مطلق کی تقیید

☆　اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ علوم اسلامیہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

کی، عبارۃ النص سے اشارۃ النص کو اخذ کرتے ہوئے مسائل کی جزئیات حل کیں اگر قرآن حکیم کا استنباط کے ساتھ لزوم کا تعلق نہ ہوتا تو وہ محض ایک جامد اور چند لوگوں کیلئے اندھی عقیدت کی اساس پر تو شاید قابل قبول کتاب ہو جاتی لیکن انسانیت عامہ اس سے پہلوتہی کا رویہ اختیار کر لیتی۔ اس مقالے میں قرآن حکیم کا اور استنباط کا باہمی ربط و تعلق اور اس کی تاریخ، نیز ائمہ اربعہ تک کے اصول استنباط پر بحث کی گئی ہے اور مثالوں سے ان کے ثمرہ اختلاف کو واضح کیا گیا ہے۔

استنباط کا لغوی و اصطلاحی مفہوم:

استنباط "نبط" سے مشتق ہے اور یہ کسی چیز کے نکالنے کے معنی میں آتا ہے استنبطت الماء کا معنی ہوتا ہے استخرجت الماء سین استفعال میں طلب کا معنی ہونے کی وجہ سے معنی یہ ہوگا کہ پانی کو خفیہ جگہ سے طلب کیا گویا استنباط کا مفہوم یہ ہوا کہ کسی چھپی ہوئی چیز کو منظر عام پر لانا۔ استنبط الفقیه کا معنی ہوگا کہ فقیہ نے کسی مسئلہ میں جدوجہد کر کے نصوص کے اندر سے چھپے ہوئے مسئلہ کو ظاہر کیا اور نکالا ہے۔ فلان یستنبط من الکلام اس وقت کہا جاتا ہے جب کلام کے ظاہر سے ایسا مفہوم نکالے جو دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہو(۱) قرآن حکیم میں ہے ﴿وَلَوْ رَدُّوْهُ إِلَى الرَّسُوْلِ وَإِلٰى أُولِى الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ﴾ [النساء ۸۳] یعنی یستخرجونه منهم۔

استنباط کی اصطلاحی تعریف یہ ہے۔

"استخراج المعانی من النصوص بفرط الذهن وقوة القريحة" (۲)

یعنی ذہانت اور سلیم الفطرتی طاقت سے نصوص کے اندر چھپے ہوئے معانی کو نکالنا۔ لغوی اور اصطلاحی مفہوم میں مطابقت واضح ہے۔

استنباط اور اجتہاد:

اجتہاد کے لغوی معنی کسی بات کی تحقیق میں انتہائی جدوجہد کرنا۔ عرب کے ہاں یہ لفظ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کوئی کام محنت شاقہ کا طالب ہو اور اس میں جدوجہد کی جائے (۳) اجتہاد کی اصطلاحی تعریف یہ ہے۔ "هو استفراغ الجهد وبذل غاية الوسع امافی درك الأحكام الشرعية وامافی تطبيقها" (۴) یعنی دو مقامات پر استنباط میں اپنی پوری قوت صرف کر دینا اجتہاد ہے ایک ان مسائل میں جو پہلے موجود نہیں ہیں ان کا حل دریافت کرنا دوسرے وہ مسائل جو موجود ہیں ان کا موقع و محل متعین کرنا۔

استنباط اور اجتہاد کے درمیان نسبت عمل اور نتیجے کی ہے کہ استنباط خفیہ مسائل کو ظاہر کرنے کا نام ہے اور یہ نتیجہ ہے اجتہاد کا اور اجتہاد اس جدوجہد کا نام ہے جس کے ذریعے سے استنباط کیا جاتا ہے اور یہ عمل ہے استنباط کرنے کیلئے۔

مقصد نزول قرآن اور استنباط:

قرآن حکیم اپنے نزول کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہتا ہے ﴿کِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّورِ﴾ [ابراھیم ۱] ہم نے اس کلام مجید کو اس لئے اتارا کہ آپ لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالیں یعنی انسانی زندگی کے تمام الجھاؤ چاہے وہ سیاسی ہوں معاشی ہوں فکری انتشار پر مبنی پیچیدگیاں ہوں یا تہذیب وتمدن کی تشکیل میں مسائل درپیش ہوں ان مسائل میں نور فراہم کرنا راہنمائی دینا قرآن حکیم کے نزول کا مقصد اصلی ہے۔ چونکہ کل انسانی نوع کے مسائل یکساں اور ایک دوسرے سے مربوط ہیں تو قرآن حکیم نے ان مسائل کا حل انسانی اساس پر پیش کیا ہے کسی گروہ یا خاص افراد پر مشتمل طبقہ ہی اس کا مخاطب نہیں ہے۔ اس کیلئے قرآن حکیم فرد کی شعوری زندگی سے لیکر ازدواجی، خاندانی، قومی، عالمی اور پھر خاندانوں، قوموں کے درمیان معاشی لین دین قوموں کے درمیان صلح وجنگ کے مسائل، امن وامان قائم رکھنے کے اصول، جبر وتشدد کے خاتمے کے مسائل میں نیز انسان اور اللہ کے مابین تعلقات کے حوالہ سے مکمل رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ ان تمام مسائل میں عدل وانصاف کل انسانیت کا تقاضا ہے لہذا ان اصول پر انسانی سماج کی تشکیل بجائے کسی گروہ یا فرقہ کے کل انسانیت کے حق میں نتائج پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح یہ کتاب مقدس ھدی للناس بن کر سامنے آتی ہے اور ان مسائل کے حل پر مشتمل علم "علم الاحکام" کہلاتا ہے۔

علم الاحکام کی حکمتیں، نتائج اور ان کی ترغیب وترہیب اور اہمیت سمجھانے کیلئے کبھی تاریخ، سے کبھی تغیرات کونیہ سے اور کبھی اعمال کے نتائج مرتب ہونے سے قرآن حکیم استدلال کرتا ہے اور کبھی بے عمل لوگوں کے رویوں کی تفصیلات بیان کر کے ان سے بچنے کی تاکید کرتا ہے۔ قرآن حکیم کا نزول حجاز میں ہوا اور اس کے اولین مخاطب عرب تھے اس لئے اس تمام تر افہام وتفہیم کیلئے لب ولہجہ عرب کے عادات واطوار کو سامنے رکھ کر اختیار کیا گیا ہے نبی اکرمؐ نے بحیثیت مفسر قرآن اس قرآن کے دیئے گئے اصول کی روشنی میں حکمت عملی طے کی اور اسے عملی جامہ پہنایا چونکہ آپ کی یہ ساری عملی تطبیق اجتماعی عمل کے ذریعے سے تکمیل پذیر ہوئی اس لئے حضورؐ کی تربیت کے نتیجے میں جماعت کے فقہاء صحابہ نے بھی آپؐ کی ہی طرز پر استدلال، اجتہاد اور قیاس کر کے

قوانین مستنبط کئے ۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبلؓ (متوفی ۱۸ھ) کو جب نبی اکرمؐ نے یمن کا گورنر بنایا تو پوچھا، معاذ فیصلے کیسے کرو گے؟ تو فرمایا: کتاب اللہ سے، حضورؐ نے پوچھا اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ تو؟ فرمایا رسول اللہؐ کے اسوہ حسنہ سے، پوچھا اگر آپ کو میری سنت سے بھی وہ فیصلہ نہ ملے تو؟ فرمایا اجتھد برأیی و لاآل کہ میں اجتہاد و استنباط کے ذریعے مسئلہ نکالوں گا تو حضورؐ نے شاباش دی اور فرمایا ((اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَفَّقَ رَسُوْلَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ کَمَا یَرْضٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ)) (۵)

ترجمہ: کہ تمام تعریفیں اس اللہ کیلئے ہیں جس نے اللہ کے رسول کے قاصد کو یہ توفیق دی ہے کہ وہ مسائل کا حل نکال کر رسول اللہ ﷺ کی رضاء کا باعث بن رہا ہے۔

نبی اکرمؐ کی حضرت عمرؓ کے متعلق شہادت موجود ہے جس میں آپ نے فرمایا تھا ((لَقَدْ کَانَ فِیْمَا کَانَ قَبْلَکُمْ مِنَ الْاُمَمِ مُحَدَّثُوْنَ فَاِنْ کَانَ مِنْ اُمَّتِیْ اَحَدٌ فَعُمَرُ رضی اللہ عنہ)) (۶) کہ پہلی امتوں میں بھی الہامی لوگ گذرے ہیں اور اگر میری امت میں یہ منصب کسی کیلئے مقدر ہے تو عمرؓ کیلئے ہے اور آپؐ کی اصابت رائے کی بابت رسول اللہؐ نے فرمایا ((اِنَّ اللّٰہَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ)) (۷) کہ اللہ تعالی نے حق کو عمرؓ کی زبان پر جاری کر دیا ہے۔

من جملہ ان اجتہادات کے ایک معرکۃ الآراء استنباط عراق کی مفتوحہ زمینوں کے بارے میں ہے جس پر ایک سال تک مجلس مشاورت میں یہ مسئلہ زیر بحث رہا، ایک رائے یہ تھی کہ اس کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے دوسری رائے یہ تھی کہ مرکزی بیت المال کو مالی طور پر مستحکم کرنے کیلئے مستقل آمدنی کا اسے ذریعہ بنایا جائے۔ دونوں اطراف سے دلائل اور بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر کار حضرت عمرؓ کے اس آیت ﴿کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ﴾ [الحشر ۷] سے استنباط کی بنیاد پر اراضی عراق کو تقسیم نہ کرنے پر تمام صحابہ کرامؓ کا اتفاق ہو گیا۔ (۸)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا شمار بھی ان فقہاء صحابہ کرامؓ میں ہوتا ہے جو خلیفہ کے ساتھ بطور مشیر رہتے تھے۔ چنانچہ عراق کی فتح کے بعد مشرقی اقوام کے ساتھ رابطے اور فوجی حکمت عملی کے پیش نظر جب ایک مرکز کی ضرورت پیش آئی تو ساتھ عراق میں بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں اسلامی قانون کو مرتب کرنے کی فکر بھی لاحق ہوئی۔ اس مقصد کی تکمیل کیلئے حضرت عمرؓ نے ابن مسعودؓ کو بطور معلم اور استاد کے وہاں بھیجا۔ عراق کے مختلف مراکز میں جو قوانین مستنبط ہوئے ان تمام کے پیچھے ابن مسعودؓ کی صحبت اور تربیت کارفرما تھی عراق کے مرکزی شہر

کوفہ والوں کو حضرت عمرؓ نے بطور خاص یہ اہمیت بتائی کہ میں عمار بن یاسرؓ کو امیر اور ابن مسعودؓ کو معلم اور وزیر بنا کر آپ لوگوں کے پاس بھیج رہا ہوں۔ یہ رسول اللہؐ کے معزز صحابہ میں سے ہیں تمہیں چاہیے کہ ان دونوں کی پیروی کرو اور ان کی بات سنو میری خواہش تو یہ تھی کہ عبداللہ بن مسعودؓ کو اپنے سے جدا نہ کروں لیکن میں نے تمہاری ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم جانا۔(۹)

حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے فقہی استنباطات اظہر من الشمس ہیں اور حضرت عائشہؓ تو بے شمار صحابہؓ کی استاذ ہیں۔ مدینہ منورہ کی مسند علم وفقہ کو ان حضرات کے اجتھادات اور تفقہ سے چار چاند لگے۔ یہ وہ خیر القرون کا زمانہ جس میں نبی اکرمؐ نے قرآن حکیم سے مفصل مسائل مستنبط کیے اور پھر آپ کے صحابہ کرامؓ نے اسی انداز سے مسائل کا استنباط جاری رکھا اور انسانی سوسائٹی کو تعلیمی، سیاسی اور معاشی اعتبار سے ترقی دی۔ قرآن حکیم سے یہ استنباط سنت کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے حنفیہ کے نزدیک سنت کا مفہوم خیر القرون کے استنباطات تک وسیع ہے۔(۱۰) اور اسی خیر القرون کے مشیران فقہائے صحابہؓ حجازی فقہ اور عراقی فقہ کے مؤسس بنے۔ تابعین کے دور میں حجازی فقہ کو فقہائے مدینہ یعنی فقہائے سبعہ (۱۱) کے ذریعے وسعت ملی اور اس کو امام مالکؒ نے مدون کر دیا جبکہ عراقی فقہ کو علقمہ (۶۲ھ) ابراہیم نخعی (۹۵ھ) حماد (۱۲۰ھ) اور امام ابوحنیفہ (۱۵۰ھ) کے ذریعے وسعت ملی جس کو قاضی ابو یوسف (۱۸۳ھ) نے کتاب الخراج کے عنوان سے مدون کر دیا اور دوسری طرف امام مالک سے مؤطا میں استفادہ کرنے والے امام ابوحنیفہ کے شاگرد محمد بن حسن شیبانی (۱۸۹ھ) نے دونوں اساتذہ کے علوم کو عراقی عرف ومزاج کی مناسبت سے مدون کر دیا جو مؤطا محمد، کتاب الآثار جیسی کتب میں محفوظ ہے۔ اس طرح گویا حجازی فقہ اور عراقی فقہ کی اساس خلفاء ثلاثہؓ کے وہ سیاسی، اقتصادی اور فکری استنباط ہیں جو انہوں نے رسول اللہؐ کے زیر تربیت سیکھے تھے اور ان پر تمام صحابہؓ کا اجماع تھا مولانا عبید اللہ سندھیؒ (۱۹۴۴ء) اس کی وضاحت یوں فرماتے ہیں قرآن مجید کی حیثیت قانون اساسی کی ہے۔ یہ غیر متبدل ہے رسول اللہؐ کی صحبت اور تعلیم سے اس قانون اساسی پر عمل کرنے والی صحابہؓ کی ایک جماعت تیار ہوئی تھی جسے قرآن میں ﴿السَّابِقُوْنَ الْأَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ﴾ [التوبۃ ۱۰۰] کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس جماعت نے قرآن کی روشنی میں اور اس سے استنباط کر کے جو تمہیدی قوانین بنائے وہ بھی سنت میں داخل ہیں۔ یہ جماعت حضرت عثمانؓ کی شہادت تک متفق اور متحد رہی ان کا یہ دور خیر القرون کہلاتا ہے (۱۲) مزید فرماتے ہیں حضرت عثمانؓ کے بعد قرآن وسنت اور اس خیر القرون کے اجماعی فیصلوں کی اساس پر ہر زمانے کیلئے

نئے نئے بائی لاز (قوانین) بنتے رہے ان بائی لاز بنانے والوں کو قرآن نے ﴿وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ﴾ [التوبۃ ۱۰۰] کا نام دیا ہے ان بائی لاز میں زمانے اور عرف کے تغیرات کو مدنظر رکھتے ہوئے تبدیلیاں لائی جاتی رہیں گی اور نئی نئی پیش آنے والی صورتوں کے متعلق پہلے احکام سے مزید قاعدوں کا استخراج ہوتا رہے گا اس کا نام فقہ ہے (۱۳) الغرض قرآن حکیم اور علم فقہ کا باہمی تعلق نظریہ اور عمل کا ہے اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

قرآن اور فقہاء کے اصول استنباط:

قرآن حکیم عربی اسلوب میں نازل ہوا اور عربی تمدن کے تناظر میں اس نے انداز کلام اختیار کیا ہے۔ جب اسلام غیر عرب اقوام میں پہنچا تو یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ ہر قوم کے سوچنے کا ایک انداز ہوتا ہے، ان کا اپنا طرز تکلم ہوتا ہے، تمدن کے اختلاف سے اظہار خیال کے طور طریقے اور عرف مختلف ہوتے ہیں۔ ضرورت تھی کہ قرآن حکیم کے خطاب کو فطرت انسانی تک رسائی دینے کے لئے اصول وضابطے وضع کئے جائیں۔ ظاہر ہے کہ اصول وضع کرنے والے کے ہاں بھی ایک تمدن اور اس کا معیار ہوتا ہے نیز ذہنی وسعت اور زمانی و مکانی اثرات سے بھی وہ قواعد وضوابط ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ اس لئے صحابہ کرامؓ کے ہاں بھی فقہی جزئیات میں اختلافات ملتے ہیں اور یہی چیز آگے چل کر تابعین و تبع تابعین میں نمایاں ہوکر مسلک کی صورت اختیار کرتی ہے اور ہر علاقے اور عرف کی ایک مستقل فقہ وجود میں آتی ہے۔ فقہ حجازی اور فقہ عراقی کی صورت میں متعدد مکاتب فکر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ قواعد وضوابط کے وضع کرتے ہوئے کس عرف کا کس انداز سے لحاظ رکھا گیا اور مسائل کے استنباط کے اصول اور تقاضے کس عرف میں کیا تھے۔؟ اس فصل میں ان کا بیان ہوگا۔

نبی اکرم ﷺ اور اصول استنباط:

نبی اکرم ﷺ نے بحیثیت مفسر اور مجتہد اعظم استنباط احکام کی طرف متعدد طرق سے راہنمائی فرمائی۔ چنانچہ آپؐ نے مجمل کی تفسیر کی، کبھی مشکل کی وضاحت کی، کبھی عام کی تخصیص کی اور کبھی مطلق کی تقیید کی۔

۱۔ مجمل کی تفسیر:

قرآن حکیم نے احکام کے اشارات دیئے اور نبی اکرم ﷺ نے اپنے عمل کے ذریعے اسکا ڈھانچہ مکمل کردیا۔ چنانچہ نماز کے حوالے سے اشارات قرآنیہ ملاحظہ ہوں

۱۔ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ میں نماز کے قیام کا حکم ہے کسی ٹائم ٹیبل کا ذکر نہیں ہے۔

۲۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَا نَتْ عَلَی الْمُوْ مِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْ قُوْ تًا۔ (النساء ۱۰۳) بیشک نماز مسلمانوں پر وقت کی قید کے ساتھ فرض کر دی گئی ہے۔ اس آیت سے ٹائم ٹیبل کیطرف اشارہ ہے۔

۳۔ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ۔ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰ اتِ وَالْاَرْ ضِ وَ عَشِیًّا وَ حِیْنَ تُظْهِرُوْنَ (الروم ۱۷، ۱۸) پس پاکی ہے اللہ کیلئے اور آسمانوں وزمین میں اسکے لئے ستائش ہے جب تم پر شام آتی ہے اور جب تم پر صبح ہوتی ہے اور جب دن کا آخری وقت ہوتا ہے اور جب تم پر دوپہر ہوتی ہے۔

اس آیت میں تسبیح کا ذکر ہے اور تسبیح قلب ولسان وجوارح تینوں سے ہوتی ہے اور نماز میں بھی ان تینوں کا ذکر ہے۔

اسی لئے مفسرین نے اس سے مراد نماز لی ہے۔

۴۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ۔ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْهُوْدًا (الاسراء ۷۸) اے پیغمبر ﷺ نماز قائم کر سورج کے ڈھلنے کے وقت سے لیکر رات کے اندھیرے تک (یعنی ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کے وقتوں میں) نیز صبح کی تلاوت قرآن (یعنی صبح کی نماز) بلا شبہ صبح کی تلاوت قرآن ایک ایسی تلاوت ہے جو دیکھی جاتی ہے۔

۵۔ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ الْغُرُوْبِ۔ وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ السُّجُوْدِ (ق ۲۹۔۳۰) یعنی طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہئے اور کچھ رات کے وقت اس کی تسبیح کیجئے اور نمازوں کے بعد بھی۔

۶۔ نبی ﷺ کو حکم ہے وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِ بْكَارِ۔ (المومن ۵۵) حضرت زکریا علیہ السلام کو حکم ہوا وَسَبِّحْ بِالْعَشِیِّ وَالْاِ بْكَارِ (آل عمران ۴۱) ان آیات میں کہیں نماز کی تصریح اور کہیں تسبیح وتحمید ہے اور نمازوں کے اندر بھی یہی مطلوب ہے

۷۔ حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی۔ (البقرہ ۲۳۸) یعنی تمام نمازوں کا اہتمام کرو اور بالخصوص درمیانی نماز کا۔ ان اشارات کو جمع کیا جائے تو نماز کے پانچ اوقات متعین ہو جاتے ہیں۔

امام رازی (۶۰۶ھ) فرماتے ہیں والصلوۃ الوسطی یدل علی شیئ أزید من الثلاثة وا لالزام التکرار، والأصل عدمه۔ ثم ذلك الزائد یمتنع أن یکون أربعة و الاّ فلیس لها وسطی فلا بدو

أن ینضم إلی تلك الثلاثة عدد آخر یحصل به للمجموع وسط وأقل ذلك أن یكون خمسة فهذه الآیة دالة علی وجوب الصلوات الخمسة بهذا الطریق۔ یعنی الصلوۃ الوسطی (درمیانی نماز) تین سے زیادہ کسی چیز پر دال ہے۔ ورنہ تکرار لازم جائے گا۔ **حافظوا علی الصلوات** میں جمع کا صیغہ بھی تین پر دال ہے اور مکرر ذکر بغیر وجہ کے معیوب ہوتا ہے۔ پھر یہ زائد چار نہیں ہو سکتے کہ اس میں درمیانی نماز کا تعین نہیں ہوسکتا اسلئے لازمی ہے کہ تین پر اضافہ دو نمازوں کا ہو، تاکہ ان نمازوں میں ایک وسطی ہو۔ تو معلوم ہوا کہ کم از کم نمازیں پانچ ہوئیں۔

اسی طرح نماز کے ارکان کے حوالے سے بھی قرآن حکیم نے اشارات دیئے ہیں مثلاً،

۱۔ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (البقرہ ۲۳۸) ۲۔ ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ۔۔۔(الحج ۷۷)

۳۔ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (المزمل ۲۰) ۴۔ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (البقرہ ۱۴۴)

اور دیگر آیات سے نماز کا ڈھانچہ نبی اکرم ﷺ نے متعین فرما دیا۔

۵۔ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (الواقعہ ۷۴) ۶۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى (الاعلیٰ)[15]

۷۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (المدثر ۳)

اور اسطرح کی دیگر آیات سے نماز میں تسبیحات اور تکبیرات متعین ہوئیں۔

ایک رکعت پر نماز کا اطلاق نہیں ہوسکتا تو کم از کم نماز دو رکعات پر مشتمل ہوگی۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ **فرضت الصلوۃ رکعتیں رکعتین فاقرت فی السفر وزیدت فی الحضر**[16] یعنی نماز دو دو رکعت کی صورت میں فرض ہوئی سفر کی حالت اسی کو بحال رکھا گیا اور حضر کی حالت میں اضافہ کر کے چار کر دیا۔ اسی طرح نماز میں مقام عبودیت کا سب سے زیادہ اظہار سجدہ میں ہوتا ہے اسکو ہر رکعت میں دو مرتبہ کر دیا گیا[17] اسی انداز میں اجمال کی تفسیر روزہ، زکوۃ اور حج میں بھی ہے۔

۲۔ مشکل کی وضاحت:

الف۔ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ [البقرۃ ۱۸۷] میں بظاہر سفید دھاگے اور کالے دھاگے میں تمیز کرنا فجر ہونے کی علامت ہے جہاں سے روزے کا آغاز ہوتا ہے جبکہ اس کے لئے مکمل روشنی درکار ہے تو نبی اکرم ﷺ نے اس کی وضاحت فرما دی کہ سفید دھاگے سے

مراد صبح کی سفیدی اور کالے دھاگے سے مراد رات کی تاریکی ہے۔(۱۸)

ب۔لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ (یونس ۲۶) زیادۃ کی وضاحت مطلوب ہے جسکو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ الحسنی سے مراد جنت ہے اور زیادہ سے مراد دیدار الٰہی ہے(۱۹)۔

ج۔وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ (الانفال ۶۰) قوت کی وضاحت ضروری ہے کہ وہ کس چیز کی اور کس درجہ کی ہے۔تو آپ ﷺ نے فرمایا الا ان القوۃ الرمی(۲۰)

۳۔ عام کی تخصیص:

﴿اَلَّذِيْنَ ءَامَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ﴾ [الانعام ۸۲] میں ظلم کا لفظ عام ہے اجتماعی ظلم کو بھی شامل ہے اور اعتقادی ظلم کو بھی شامل ہے صحابہ کرامؓ نے اسی عموم کی وجہ سے تردد کا اظہار کیا کہ " اینالم یظلم نفسہ؟" تو رسول اللہ ﷺ نے اس کی تخصیص کردی کہ اس سے مراد اعتقادی ظلم یعنی شرک ہے اور دلیل میں حضرت لقمانؑ کا قول پیش کیا ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ [لقمان ۱۳](۲۱)

۴۔ مطلق کی تقیید:

جیسے ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا﴾ [المائدۃ ۳۸] میں ید مطلق ہے حضور ﷺ نے پہلی دفعہ دایاں ہاتھ کاٹا ہے جب خیار بن عدی بن نوفل بن عبد مناف پر اسلام میں سب سے پہلی چوری ثابت ہوئی (۲۲) تو دائیں ہاتھ کی تقیید اس سے ثابت ہوئی۔

صحابہ کرامؓ اور اصول استنباط:

رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں قانون کا مرکز آپ ﷺ کی ذات اطہر تھی۔اس لئے احادیث مبارکہ میں آپ ﷺ سے مختلف اصول استنباط معلوم ہوتے ہیں آپ ﷺ نے جماعت صحابہؓ میں بھی حسب درجات یہ صلاحیت منتقل کی۔ چنانچہ اس جماعت نے حالات کی گہرائی کو سمجھتے ہوئے قرآن وسنت سے مسئلہ اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا کرلی۔ جماعت صحابہؓ میں صحبت اور صلاحیتوں کے تفاوت نیز حالات کے واسطہ پڑنے کے اعتبار سے بھی مسئلہ کے استنباط میں تفاوت تھا مثلاً:

چار خلفاءؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، ابوموسی اشعریؓ، معاذ بن جبلؓ، ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ اجتہاد کرنے میں دیگر صحابہ کرامؓ سے نمایاں تھے۔گویا ان حضرات میں بھی اجتہاد کے درجات میں تفاوت تھا مثلاً

حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اجتہاد سے زیادہ کام لیتے تھے۔ جبکہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ کے اجتہاد کا دائرہ اتنا وسیع نہ تھا۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔

۱۔ ذوق اجتہاد میں تفاوت کہ کسی کا ذوق اجتہاد قوی تھا اور کسی کا کم۔

۲۔ اجتہاد کے مواقع میں تفاوت کہ کسی کو اجتہادی مسائل سے زیادہ سابقہ پڑا تھا اور کسی کو کم۔

حضرت ابوبکرؓ کا دور چونکہ انقلاب نبویؐ کے استحکام کا دور تھا لہذا ان حالات میں نئے مسائل کم پیش آئے اور اجتہاد کی ضرورت زیادہ نہ تھی۔ حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ زیادہ تر مدینہ منورہ میں ہی رہے ان کو نئے مسائل سے وہ واسطہ نہیں پڑا جو دوسرے فقہاء صحابہؓ کو پیش آئے۔

حضرت عمرؓ کا دور نئی فتوحات اور اسلام کی وسعت کا دور تھا آئے دن نئے سے نئے مسائل سامنے آتے اور باہمی مشاورتیں ہوتیں جس سے اجتہاد کو وسعت ملی۔ اسی طرح حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ جو عراق جیسے بین الاقوامی سنگم کے حامل علاقے میں تھے۔ وہاں نئے سے نئے مسائل پیش آتے رہے اور اجتہاد میں وسعت پیدا ہوتی رہی۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے وہاں کیلئے ابن مسعودؓ کو منتخب کیا۔ صحابہ کرامؓ کے پیش نظر اصول استنباط میں چند امور تھے۔

۱۔ قرآن وسنت میں پیش آمدہ مسئلے کا صریحاً یا اشارۃً تذکرہ موجود ہو تو اس کو بنیاد بنانا جیسے زمین کے نظم ونسق کے بارے میں حضرت عمرؓ کا آیت فے ء سے استدلال اس کا مفصل تذکرہ گزر چکا ہے۔

۲۔ اشباہ ونظائر پر قیاس کرنا جیسے حضرت ابوبکرؓ نے مانعین زکوۃ کے حوالے سے نماز پر قیاس کرتے ہوئے اس کو فتنے کی اساس قرار دیا۔

۳۔ انسانی سوسائٹی کے عرف کا تفاوت۔ چونکہ قرآن حکیم عربی میں نازل ہوا اور اس نے عرب تمدن کو اساس بنا کر قریش کو پہلے درجے میں مخاطب کیا لیکن دوسری اقوام کے اپنے اپنے تمدن تھے۔ ان کے ماحول میں قرآنی تعلیمات کی روح کیسے قائم کی جائے؟ اس کا دارومدار انسانی سہولیات اور ارتفاقات پر ہے۔ جس سوسائٹی میں جس انداز سے آسانی ہوگی اس کی اساس پر مسائل مستنبط کیے جائیں گے۔ (۲۳)

صحابہ کرامؓ میں تفاوت اجتہاد کے اسباب:

صحابہ کرامؓ میں سے جو درجہ اجتہاد پر فائز تھے ان کے اجتہاد میں کمی یا کثرت کے علاوہ اجتہاد میں تفاوت بھی تھا جس کے اہم اسباب یہ ہیں۔

۱۔ ایک ہی آیت سے دو مختلف حکموں کا ثابت ہونا جیسے قرآن حکیم کی یہ آیت جب نازل ہوئی ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ [المائدہ ۳] تو تکمیل دین کو خوش خبری سمجھتے ہوئے صحابہ کرامؓ خوش ہو رہے تھے، لیکن حضرت عمرؓ رونے لگے ان سے جب سبب پوچھا گیا تو فرمایا کہ ((مابعد الکمال الاالنقص)) یعنی کمال دلیل زوال ہوتا ہے گویا اس میں نبی اکرم ﷺ کے وصال کی خبر معلوم ہو رہی ہے اور ایسا ہی ہوا اس کے بعد آپ ﷺ صرف ۸۱ دن دنیا میں تشریف فرما رہے۔(۲۴)

۲۔ موقع ومحل کی تعیین کے بارے میں اختلاف: جیسے ابن عمرؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ احزاب سے واپسی کے موقع پر ارشاد فرمایا ((لایصلین احد العصر الافی بنی قریظة)) تو صحابہؓ کے ایک طبقے نے راستے میں عصر کی نماز ادا کی۔ اس استدلال پر کہ حضور ﷺ کی مراد اس سے یہ ہے کہ جنگ احزاب والے مقام سے جلد نکلا جائے دوسرے طبقے کی رائے یہ تھی کہ حضور ﷺ نے بنو قریظہ میں ہی نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے چنانچہ انہوں نے نماز مؤخر کر دی جب حضور ﷺ کے سامنے اس کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے کسی پر بھی ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا۔(۲۵)

۳۔ حدیث نبوی ﷺ کی اطلاع نہ ہونے کی وجہ سے اختلاف: یہ فطری طور پر مسلم ہے کہ تمام صحابہ کرامؓ ہمہ وقت موجود نہیں ہوتے تھے تو کسی نے حضور ﷺ سے کوئی حدیث سن لی اور کسی کو اس کے متعلق اطلاع نہیں ہوئی جس کی وجہ سے آراء کا اختلاف ہو جانا یقینی ہے جیسے رسول اللہ ﷺ کے وصال کے وقت سقیفہ بنو ساعدہ میں خلافت کے مسئلہ پر صحابہ کرامؓ کی مشاورت ہو رہی تھی مہاجرین کا خیال تھا کہ خلافت ہمارا حق ہے کہ ہم نے وطن چھوڑا، شروع سے ہی قربانیاں دیں۔ انصار کا خیال تھا کہ خلافت ہمارا حق ہے کہ ہم نے مرکز قائم کرنے کیلئے ہر قسم کی سختیاں اور مخالفتیں برداشت کیں مہاجرین کو اپنے مال وغیرہ میں حصہ دار بنایا۔ کوئی فیصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضور ﷺ کی حدیث ((الائمة من قریش)) (۲۶) سنائی جس پر تمام خاموش ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کا ہاتھ پکڑ کر بیعت کا آغاز کیا اور پھر تمام نے بیعت کر لی۔

۴۔ اصول کی روشنی میں خبر کی تصدیق کرنے میں اختلاف جیسے ابن ابی ملیکہؒ کی روایت ہے کہ جب حضرت عثمانؓ کی بیٹی فوت ہوئیں ہم لوگ وہاں گئے تو عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ بھی وہاں موجود تھے۔ ابن عمرؓ نے عمرو بن عثمانؓ کو کہا کہ آپ لوگوں کو رونے سے کیوں نہیں روکتے حالانکہ حضور ﷺ نے فرمایا ((ان المیت لیعذب ببکاء اھلہ علیہ)) تو ابن عباسؓ نے ایک واقعہ سنایا کہ جب حضرت عمرؓ زخمی ہوئے تو صہیب

رومیؓ (۳۸ھ) رونے لگے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ صہیب مجھ پر رو رہے ہو حالانکہ حضورﷺ نے فرمایا ہے کہ ((ان المیت لیعذب ببکاء اهله علیه)) ابن عباس فرمانے لگے کہ حضرت عمرؓ جب دنیا سے رخصت ہوگئے تو میں نے یہ سارا واقعہ حضرت عائشہؓ کے سامنے ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عمرؓ پر رحم کرے حضورﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ مؤمن جب فوت ہو جائے تو اہل خانہ کے رونے کی وجہ سے اس کو عذاب ہوتا ہے بلکہ حضورﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ ((ان اللہ لیزید الکافر عذابا ببکاء اهله علیه)) یعنی اللہ تعالیٰ کافر کے اہل خانہ کے اس پر رونے کی وجہ سے اس کے عذاب میں اضافہ کر دیتا ہے اور اس پر قرآن کے دیئے گئے اصول سے استدلال کیا۔ فرماتی ہیں "حسبکم القرآن" ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ [الاسراء ۱۵] (۲۷)

تابعین اور اصول استنباط:

صحابہ کرامؓ کی تربیت کے نتیجے میں تابعین کی ایک جماعت تیار ہوئی۔ جن میں ایک طرف فقہاء سبعہ تھے جنہوں نے اہل مدینہ کے تمام علم کو محفوظ کر لیا اور انہی کے شاگردوں سے امام مالکؒ (۱۷۹ھ) نے علم حاصل کیا اس لحاظ سے امام مالکؒ کی کتاب المؤطا نے تمام اہل مدینہ کے علوم و فتاوی پر مبنی ایک مجموعے کے طور پر اساس فراہم کر دی۔ دوسری طرف اہل عراق جن کے سامنے حضرت عمرؓ کے فتاوی کے علاوہ حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کے استنباط تھے جو اہل عراق کیلئے مرجع کی حیثیت رکھتے تھے (۲۸) مدینہ منورہ جو حجازی فقہ کا مرکز تھا، اس میں اصول استنباط یہ کارفرما تھا کہ کتاب اللہ کے بعد سنت رسول اللہﷺ اور اس کے بعد فقہاء سبعہ کا جس مسئلے پر اجماع ہو اس کے مطابق فیصلے کرنا۔ اور عراقی فقہ کا اصول یہ تھا کہ کتاب اللہ کے بعد سنت رسول اللہﷺ اور اس کے بعد اجتہاد کی اساس پر فتوی دینا اس اعتبار سے بنیادی طور پر دو ہی طریق استنباط تھے ایک حجازی اور دوسرا عراقی۔

عبدالقاہر بغدادی (۴۴۹ھ) فرماتے ہیں جب کسی مسئلے پر حضرت علیؓ، حضرت زیدؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ متفق ہوتے ہیں تو اس میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا لیکن جس مسئلے میں زید بن ثابتؓ اپنے تین ساتھیوں سے الگ موقف اختیار کرتے ہیں تو امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اکثر ان کے ہم نوا ہوتے ہیں اور اگر ابن مسعودؓ اپنے تین احباب سے اختلاف کرتے ہیں تو علقمہ اور اسود ان کی رائے کو لیتے ہیں۔ (۲۹)

فقہاء اربعہ اور ان کے اصول استنباط:

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں اصول فقہ میں مذکور مسائل دو قسم کے ہیں ایک قسم وہ ہے جو لغت کی روشنی میں حل کئے جاتے ہیں جیسے عام، خاص، نص، ظاہر وغیرہ یہ اسی طرح ہے جیسے نحویوں کے ہاں اسم نکرہ اور معرفہ ہوتا ہے اس قسم میں کچھ زیادہ اختلافات نہیں پیدا ہوتے۔ دوسری قسم وہ جس میں عاقل کیلئے اشارات موجود ہوں او ہر ذی عقل اپنے انداز سے اس کو پڑھے یا سمجھے اس کی مثال اسی طرح ہے کہ ایک کتاب کے حروف دھندلے ہو گئے ہوں اور دو افراد سے اس کی عبارت پڑھوائیں تو ہر ایک ان میں سے جو اس کے ذہن کے قریب ہو گا وہی پڑھے گا اسی طرح جب فقہاء نے ایسی قابل احتمال احادیث کو دیکھا اور اس میں غور کیا تو کسی نے ایک احتمال کو منسوخ قرار دیا کسی نے اسے راجح قرار دیا اور کسی نے متعدد احتمالات میں تطبیق پیدا کی اور یہ انداز جب ان کے متبعین میں منتقل ہوئے تو مسلک کی شکل اختیار کر گئے۔ (۳۰)

اس اصول پر پیدا ہونے والے اختلافات میں ہر رائے پر ایک طبقہ تعلیم و تعلم کا راستہ اختیار کرتا ہے تو المدرسۃ العلمیۃ یا الجمعیۃ العلمیۃ کہلاتا ہے۔ جب ایک رائے کے حاملین کے خیالات اور فتاوی ہر طبقے کے لوگوں تک پہنچ جاتے ہیں اور انہی تلقی بالقبول حاصل ہو جاتی ہے تو وہ طریقۃ متبعۃ کہلاتا ہے اور جب ان کے ہاتھ قوت نافذہ آ جائے تو وہ مذہب بن جاتا ہے۔ اس دوسری قسم میں ایک طبقے نے اہل مدینہ کے اجماع کو حجت مانتے ہوئے اجتہاد سے نسبتاً کم کام لیا ہے اور یہ طریقہ امام مالکؒ کا ہے یہ لوگ اہل الحدیث کہلاتے ہیں اور عراقیوں نے قیاس اور اجتہاد کا راستہ اختیار کیا تو وہ اہل الرای کہلائے اور اس اصول کو احناف نے لیا ہے ان دونوں کے امتزاج سے مستقل اصول استنباط سامنے آیا اور وہ اس لئے کہ امام شافعیؒ مدینہ سے امام مالکؒ کے شاگرد بھی تھے اور عراق سے امام محمد بن حسن شیبانی کے شاگرد بھی تھے۔ اور یہ ایک مستقل مذہب قرار پایا۔ اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ نے زیادہ تر عراقیوں سے علم حاصل کیا لیکن وہ بلند پایہ محدث بھی تھے اس طرح ان کا اصول استنباط ایک مستقل مذہب کے طور پر سامنے آیا۔ (۳۱) گویا مالکی فقہ کا دارو مدار اہل مدینہ کے عمل پر ہے احناف کی فقہ کا دارو مدار حضرت علیؓ، ابن مسعودؓ کی فقاہت اور اجتہاد پر ہے اور شوافع کے ہاں ایک بڑا حصہ تعامل اہل مدینہ کی بنیاد پر ہے اور یہ سلسلہ مصر وغیرہ کی طرف چلا ہے اور دوسرا حصہ اہل عراق کے مزاج کے مطابق ہے اور اس انداز فکر پر مبنی طریق کار خراسان وغیرہ کے علاقے میں رائج ہوا ہے۔

قرآن حکیم سے فقہاء کرام کے اصول استنباط کی مثالیں:

فقہاء کے زاویہ نگاہ کے مختلف ہونے کی وجہ سے جب اصول فقہ کی اصطلاحات مدون ہوئیں تو ان کی تشریحات بھی مختلف نظر آئی ہیں۔ مثلاً:

عام اور خاص سے مسئلہ اخذ کرنے میں فرق:

عام کا لغوی مفہوم: لغت میں عام کا اطلاق اس جملے یا کلام پر ہوتا ہے جس میں شمول ہو یعنی جس میں حکم بہت سارے افراد کو شامل ہو(۳۲) اصطلاح میں عام کی تعریف یہ ہے "اللفظ المستغرق لجميع ما يصلح له بحسب وضع واحد دفعةً بلا حصر" (۳۳) یعنی عام وہ لفظ ہوتا ہے جو بغیر کسی شرط اور قید کے اپنے ایک ہی صیغے میں تمام ممکنہ مفاہیم ومعانی کو شامل ہوتا ہے۔

جبکہ خاص لغت میں اس کلام کو کہتے ہیں جو کسی فرد پر بلا شرکت غیر منطبق ہو (۳۴) اور اصطلاح میں خاص کی تعریف یہ ہے " تخصيص العام قصره على بعض افراده بدليل متصل او منفصل "(۳۵) یعنی کسی دلیل متصل یا منفصل کے ذریعے حکم کو بعض افراد کے ساتھ خاص کر دینا۔

عام کے بارے میں امام شافعی، امام مالک اور امام احمد کی رائے:

مذکور تین ائمہ کے نزدیک ایسے عام کی دلالت اس کے افراد پر ظنی ہوتی ہے یعنی ہر عام میں اس کے بعض افراد داخل نہ ہونے کا یعنی تخصیص کا احتمال ہوتا ہے اسی وجہ سے عام کی تاکید لفظ کل اور اجمعین وغیرہ سے آتی ہے اور اسی بناء پر یہ قاعدہ ہے "مامن عام الاخص عنه البعض" جبکہ احناف کا مسلک یہ ہے کہ عام کی دلالت اس کے افراد پر قطعی ہوتی ہے البتہ کسی دلیل سے کچھ افراد مستثنیٰ کر دیئے جائیں تو پھر بقیہ پر دلالت ظنی ہو جاتی ہے اور دوسرے بعض افراد کے داخل نہ ہونے کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔

ثمرہ اختلاف:

مذکورہ اصول کے تناظر میں جن جزوی مسائل میں اختلاف ظاہر ہوتا ہے ان میں ایک کو بطور مثال ذکر کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خبر واحد اور قیاس سے عام کی تخصیص جائز ہے یا نہیں؟ احناف کے نزدیک چونکہ عام کی دلالت قطعی ہوتی ہے اس لئے اس کی تخصیص کسی ظنی دلیل یعنی خبر واحد یا قیاس سے جائز نہیں ہے ورنہ مطلب یہ ہوگا کہ اعلیٰ پر ادنیٰ اور قطعی پر ظنی کی برتری تسلیم کر لی گئی ہے صرف حدیث متواتر یا مشہور سے تخصیص کی جاسکتی

ہے۔ البتہ اگر عام کی تخصیص پہلے ہوگئی ہو تو پھر اس کی دلالت ظنی ہو جاتی ہے اور برتری کا سوال ختم ہو جاتا ہے مثلاً ﴿اَسۡکِنُوۡ ھُنَّ مِنۡ حَیۡثُ سَکَنۡتُمۡ مِنۡ وُّجۡدِکُمۡ وَلَا تُضَآرُّوۡھُنَّ لِتُضَیِّقُوۡا عَلَیۡھِنَّ﴾ [الطلاق ۶] اس آیت سے طلاق کے بعد عورت کیلئے زمانہ عدت میں خاوند پر نان نفقہ اور رہائش کا ثبوت ملتا ہے اور یہ آیت ہر مطلقہ کیلئے عام ہے جس نوعیت کی طلاق بھی ہو اس کی تخصیص اس خبر واحد سے نہیں کی جاسکتی جس میں نبی اکرم ﷺ نے حضرت فاطمہ بنت قیس (جن کو طلاق بائن دی گئی تھی) کیلئے نان نفقہ اور مکان واجب قرار نہیں دیا چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسی کے بارے میں فرمایا تھا کہ ((لا نترك كتاب ربنا و سنة نبينا ﷺ بقول امراة لاندری لعلها حفظت او نسيت)) (۳۶) احناف کے مسلک کی تائید کیلئے یہ مضبوط دلیل ہے۔ شوافع اور حنابلہ کے ہاں عام کی دلالت اس کے افراد پر ظنی ہوتی ہے اس لئے ظنی کی تخصیص ظنی چیز یعنی خبر واحد اور قیاس سے کی جاسکتی ہے۔ اس کی تائید میں وہ صحابہ کرام کی بیان کردہ تخصیص پیش کرتے ہیں۔ اور وہ اس آیت میں ہے ﴿وَاُحِلَّ لَکُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمۡ﴾ [النساء ۲۴] اس سے پہلے دو عورتوں کے ایک مرد کے نکاح میں جمع ہونے کے حوالے سے صرف دو بہنوں کا ذکر ہے اور اس آیت مذکورہ میں عموم اس پر دال ہے کہ اس کے علاوہ کسی دو عورتوں کا ایک مرد کے بیک وقت نکاح میں جمع ہونا حلال ہے جبکہ حدیث میں آتا ہے ((لا يجمع بين المراة وعمتها و لا بين المراة و خالتها)) (۳۷) یہ خبر واحد ہے اور صحابہؓ کا اجماع ہے کہ دو بہنوں کی طرح پھوپھی بھتیجی اور خالہ و بھانجی کو جمع کرنا بھی ناجائز ہے۔ اس سے وہ خبر واحد سے عام کی تخصیص کا جواز لیتے ہیں جبکہ احناف کے ہاں یہ حدیث مشہور ہے اور حدیث مشہور سے تخصیص ہوسکتی ہے اور مالکیہ کے نزدیک اس کی تخصیص کی وجہ تعامل اہل مدینہ ہے کہ وہ اس کی تائید میں ہے اگر اہل مدینہ کا تعامل اس کی تائید نہ کرتا ہو تو مالکیہ کے نزدیک بھی تخصیص جائز نہیں ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ابن فارس (۳۹۵ھ) معجم مقاییس اللغة مادة نبط :ص۹۷۲

۲۔ الجرجانی (۸۱۶ھ) علی بن محمد، التعریفات: ص۳۸

۳۔ ابن منظور (۷۱۱ھ) لسان العرب ماۃ "جهد"

۴۔ الشاطبی (۷۹۰ھ) ابواسحاق، الموافقات في أصول الشريعة مع شرح عبداللہ دراز۔ المکتبۃ التجاریۃ الکبری القاہرۃ (س۔ن) کتاب الاجتہاد :۱۳۲/۴

۵۔ ابوداؤد (ت ۲۷۵ھ) السنن باب اجتھاد الرأی فی القضاء حدیث نمبر ۳۱۱۹

۶۔ مسند احمد ۔ مسند عائشہؓ حدیث نمبر ۲۳۱۵۰

۷۔ الترمذی (۲۷۹ھ) السنن مناقب عمر بن الخطابؓ حدیث نمبر ۳۶۱۵

۸۔ شاہ ولی اللہ دھلویؒ (۱۷۶۳ء) فقہ عمرؓ مترجم ابو یحیی امام خان نوشہروی۔ علم و عرفان پبلشرز لاہور ۲۰۰۵ء :ص ۳۵۶۔۳۶۶

۹۔ ابن عبدالبر (۴۶۳ھ) الاستیعاب :۳۰۲/۱

۱۰۔ عبیداللہ سندھی، مولانا (۱۹۴۴ء) شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، ط محمود اکیڈمی لاہور (س۔ن): ص ۸۹

۱۱۔ فقہائے سبعہ یہ ہیں: عروہ بن زبیر (۹۳ھ) سعید بن المسیب (۹۴ھ) ابوبکر بن عبدالرحمٰن (۹۴ھ) عبیداللہ بن عبداللہ (۹۸ھ) خارجہ بن زید (۹۹ھ) قاسم بن محمد (۱۰۷ھ) سلیمان بن یسار (۱۰۷ھ)

۱۲۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص ۹۰

۱۳۔ ایضًا: ص ۹۰۔۹۱

۱۴۔ الرازی (۶۰۶ھ) محمد بن عمر بن الحسن فخر الدین، مفاتیح الغیب (۳/ ۲۷۷) دار احیاء التراث ، بیروت، الطبقۃ الثالثہ بدون سن طبع

۱۵۔ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فسبح با سم ربك العظيم نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا اجعلو ها فی رکو عکم اسکو اپنے رکوع میں کرلو اور جب سبح اسم ربك الا علی

نازل ہوئی تو فرمایا اجعلو ھا فی سجودکم اسکو اپنے سجدے میں کرلو۔
ابوداؤد، سلیمان بن اشعث (۲۷۵ھ) السنن باب مایقول الرجل فی رکوعہ وسجودہ۔ حدیث رقم ۷۳۶
۱۶۔ البخاری (۲۵۶ھ) محمد بن اسماعیل الامام، الجامع الصحیح، کتاب الصلوۃ، باب کیف فرضت الصلوۃ فی الاسراء۔ حدیث ۳۴۷
۱۷۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ ۱۷۶۳ء، حجۃ اللہ البالغۃ، تعلیق محمود طعمہ حلبی، دار المعرفہ بیروت، طبع دوم 2004ء/۱ ۲۱-۲۲
۱۸۔ القرطبی (۶۷۱ھ) محمد بن احمد، الجامع لأحکام القرآن :۱/۳۹
۱۹۔ الترمذی، محمد بن اسماعیل (۲۷۹ھ) السنن، باب ماجاء فی رویۃ الرب تبارک
۲۰۔ مسلم بن الحجاج امام (۲۶۱) صحیح مسلم باب فضل الرمی والحث علیه حدیث ۳۵۴۱
۲۱۔ البخاری (۲۵۶ھ) محمد بن اسماعیل، ابوعبداللہ، الجامع الصحیح باب ظلم دون ظلم :حدیث نمبر ۳۱
۲۲۔ القرطبی (۶۷۱ھ) الجامع لأحکام القرآن :۶/۱۵۹
۲۳۔ محمد تقی امینی، اجتہاد، قدیمی کتب خانہ کراچی :ص ۵۷
۲۴۔ الشاطبی (۷۹۰ھ) الموافقات فی أصول الشریعة :۳/۳۸۴
۲۵۔ البخاری (۲۵۶ھ) محمد بن اسماعیل، ابوعبداللہ، الجامع الصحیح :حدیث نمبر ۸۹۴
۲۶۔ احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) مسند انس بن مالک :حدیث نمبر ۱۱۸۵۹
۲۷۔ البخاری (۲۵۶ھ) محمد بن اسماعیل ابوعبداللہ، الجامع الصحیح :حدیث نمبر ۱۲۰۶، ۳۶۸۱
۲۸۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، امام (۱۷۶۳ء) مقدمۃ المصفی شرح المؤطا ط۔ کراچی (س۔ن) :۱/۳۴
۲۹۔ عبدالقاہر، ابومنصور، التمیمی، البغدادی (۴۲۹ھ) أصول الدین دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۹۹۵ء: ص ۳۱۱
۳۰۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، امام (۱۷۶۳ء) عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید مترجم از ڈاکٹر محمد میاں صدیقی طبع اول ۲۰۰۰ء شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد :ص ۷۰۔۷۱
۳۱۔ عبیداللہ سندھی، مولانا (۱۹۴۴ء) التمہید لتعریف أئمة التجدید تحقیق مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی طبع اول ۱۹۷۶ء لجنۃ احیاء الادب السندی جامشورو :ص ۳۵۱۔۳۵۲

۳۲۔ ۱۳۔احمد بن فارس (۳۹۵ھ) معجم مقاييس اللغة :۴/۱۸

۳۳۔ الآمدی، علی بن ابی علی (۶۳۱ھ) **الإحكام في أصول الأحكام** دارالکتب العلمية بیروت ۱۴۰۰ھ :۲/۲۸۶

۳۴۔ ۱۵۔ابن قدامہ، عبداللہ بن احمد، المقدسی (۶۲۰ھ) **روضة الناظر وجنة المناظر** دار الكتاب العربی بیروت طبع اول ۱۴۰۱ھ : ص ۱۹۴

۳۵۔ ۱۶۔الآمدی الإحكام ۲/ ۴۰۷

۳۶۔ الترمذی (۲۷۹ھ) **السنن** : حدیث نمبر ۱۱۰۰

۳۷۔ البخاری (۲۵۶ھ) محمد بن اسماعیل، **الجامع الصحيح** :حدیث نمبر ۴۷۱۷